خیابان خزاں ۲۰۲۳ء

جدید نظم سماجی تناظر

ڈاکٹر محمد عمران ازفر، شعبہ اردو زبان وادب، یونیورسٹی آف سرگودھا

ABSTRACT:

Being a review article, the aim of this text is to encompass the trends, themes, insights, and impact of three hundred years of Urdu poem. The article in its first part identifies the socio-political backdrop of colonialism and resulting social change in the Indian Sub-continent. In later part the themes and trends are identified that expression of anxiety, resistance and neglect go hand by hand in almost all eras. Specific poets and their works are cited to establish and identify trends. In last part the current trends of globalization, political resistance and identity crises are illustrated through works being published in last four decades.

Keywords: Urdu Poem; Colonialism and Urdu; Postmodernism and Urdu; Urdu Literature and Globalization

کلیدی الفاظ:- جدید نظم، سماجی تناظر، سیاسی تفاعل، کلاسیکی انفعالیت، اقبالی حرکت پسندی

جب اردو سے وابستہ کوئی قاری / سامع / تخلیق کار / نقاد جدید نظم یا نظمِ جدید کی بابت اظہارِ خیال کرتا ہے تو اس کی نظر میں وہ مخصوص فلسفیانہ ثقافتی تنافرات پر مبنی مباحث نہیں ہوتے، جو مغربی لسانیاتی دبستانوں کی طرف سے مشرقی علم و فن کا حصہ بنتے ہیں، ان میں ایک طرف تعمیرات موسیقی، مصوری عمارت سازی کے نمونے ہیں اور دوسری طرف اسلوبیاتی اور لسانیاتی سطح پر ان مباحث کا سلسلہ ہے جن کے سبب سے لفظ اور معنی کے رشتوں میں موجود روائتی باہمی تعاملات کو نئی جہات کے ساتھ دیکھنے کی ضرورت اور اہمیت پر زور دیا گیا۔ یہ سب مباحث ایک طرف فلسفیانہ کلامیوں کا احاطہ کرتے ہیں اور دوسری جانب کسی بھی ادب کے انتقادی نظام کو نئی معنوی پرتوں سے آگاہ کرتے ہیں۔ لہذا نظمِ جدید کے معنی تخلیقی تجربے کا وہ نیا اور منفرد نظام ہے جو انگریز استعمار کی آمد اور پھر ہندوستان میں استعمار کی طرف سے اپنی گہری جڑیں پیوست کرنے کے نتیجے میں، بیسویں صدی کے صنعتی انقلاب سے اردو دنیا کے عام آدمی کی زندگی کو اپنی

لپیٹ میں لے لیتا ہے جس کا مرکزی مدعا اس سرزمین سے خام مال کو انگلستان پہنچانا اور پھر اسے پراڈکٹ کی صورت میں عالمی منڈی تک لے جا کر نہایت اچھے داموں فروخت کرنا تھا۔ ہندوستان پر بتدریج اور منصوبہ بندی کے تحت قبضے کرنے والے انگریز نو آبادیات نے استعمار کے بنیادی اصول کے تحت ہندوستان کے لوگوں کے ذہنوں میں یہ بات راسخ کی کہ ہندوستانی تہذیب، ثقافت، عقائد، رسمیات اساطیر عمومی اقدار سب کی سب قدیم اور قدامت پرست اذہان کی فرسودہ روایات نمائندگی پر مبنی ہیں جبکہ نو آمدہ انگریزوں کے پاس ان ہندوستانیوں کی نسبت سے زیادہ مہذب، زیادہ علم پرور، زیادہ انسان پرست، زیادہ باوقار اور زیادہ نفیس طرز حیات اور طرز فکر کا ایک پورا ذخیرہ ہے جس کا ارتقائی تناظر ایک قدیم تاریخی اور اخلاقی روایت رکھتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ان نووارد حکمران طبقے نے ہندوستان آنے اور قابض ہونے کے بعد یہاں کی رسم ورواج کو نہیں اپنایا بلکہ اپنے چھری کانٹے اور کوٹ، پینٹ شرٹ کو یہاں کے لوگوں کے لیے قابل رشک لباس بنا کر پیش کیا۔ یہی وہ صورت حال تھی جس میں ہندوستانی عوام تیزی کے ساتھ بادشاہ سے دور ہوتے چلے گئے اور ہندوستانی زمینوں پر دھیرے دھیرے قابض ہونے والے انگریز استعمار کی بظاہر ہندوستان دوست پالیسیوں کو اپنے لیے مفید جان کر ان کی حمایت کرنے لگے۔ یہ انہی مجموعی حالات کا حاصل تھا کہ ۱۸۵۷ کا معرکہ ایک جنگ کا روپ نہ دھار سکا اور بہادر شاہ ظفر مٹھی بھر اور گھبرائی ہوئی فوج کے ساتھ مصلوب ہوئے، اپنے بیٹوں کی جان گنوائی اور آخر کار اپنی زندگی کے آخری برس نہایت ناگفتہ بہ حالت میں رنگوں میں تنہا گزارے۔ انگریز دلی پر قبضہ سے پہلے ہی ہندوستان میں اپنے فکر و فہم اور اثر ورسوخ کو عام کرنے میں جتے ہوئے تھے۔

ٹیپو سلطان کی شہادت پر "فورٹ ولیم کالج" کا قیام اور بعد میں بزرگ مغل حکمران کی طرف سے ایک غیر منطقی اور عسکری و تنظیمی سطح پر غیر منظم اور کمزور غدر کو ناکام بنانے کے بعد ذہنی طور پر حقیقی استعماری جذبات کے تحت "انجمن حمایت مطالب مفیدہ پنجاب" جیسے نو آبادیات پرست اداروں کا قیام اور ان کے طفیل مخصوص مقاصد کے حصول کی کاوشیں، انگریز استعمار کے غاصب اور سامراجی منصوبہ سازی کی واضح ترین مثالیں ہیں۔ جن کا حقیقی مقصد ہندوستان میں انگریزوں کے راج کی راہیں ہموار کرنا، عوامی رائے کو انگریزوں کے حق میں ہموار کرنا، بادشاہ اور اس کے نمائندگان کو رسوا کرنا اور پہلے سے موجود ہندوستان کی مقامی طاقتوں کو غاصب اور لٹیرا قرار دینا شامل رہا تھا جبکہ دوسری طرف ان اشرافیائی خانوادوں کو اپنا ہمنوا بنانا بھی تھا۔ جو ابھی تک انگریز حکومت میں کسی نہ کسی وجہ سے بطور حلیف شامل نہیں ہو سکے

تھے بلکہ چھوٹے بڑے گروہوں یا مسلح حریت پسند جتھوں کی صورت میں انہیں ہندوستانی سرزمین سے بے دخلی کے اشارے دے رہے تھے۔ "انجمن پنجاب" اور مولانا محمد حسین آزاد کی کوششوں کا نتیجہ ہے کہ "یادگار غالب" تصنیف کرنے والا مولانا الطاف حسین حالی اور "مقدمہ شعر وشاعری" لکھنے والا مولانا الطاف حسین حالی ایک دوسرے سے مخالف ہی نہیں بلکہ ایک دوسرے سے متصادم ہیں۔ حالی نے جس سادگی، اصلیت، جوش کو شاعری کا مرکزی جوہر قرار دیا وہ تینوں شعری عناصر بحوالہ شعریات اس نے "یادگار غالب" میں موضوع تک نہیں بنائے، نہ ہی کلامِ غالب کو سادگی، اصلیت اور جوش کے اصولوں پر جانچنے کی کوشش کی۔ کمال کا پہلو یہ ہے کہ نہ ہی الطاف حسین حالی نے اپنی تنقیدی بصیرت کے تحت یا اسے مرکز میں لاتے ہوئے "مقدمہ شعر وشاعری" کی تصنیف کے دوران میں نظیر اکبر آبادی کی نظم کے تجزیاتی مطالعہ کی کوئی ضرورت محسوس کی۔ اس طرح یہ الزام بھی اٹھتا ہے کہ مولانا محمد حسین آزاد اور مولانا الطاف حسین حالی دراصل مسلمانوں کے خیر خواہ نہیں بلکہ انگریزوں کی طرف سے قائم کردہ استعماری طاقتوں کے حقیقی خیر خواہ اور وفادار تھے اور انہوں نے انگریزی استعمار کے قیام اس کی توسیع اور اس کے استحکام کی ہر ممکن کوشش کی ہے۔ یہ بھی اپنی جگہ حقیقت ہے کہ خواہ حالی اور آزاد انگریز استعمار کے پروردہ ہو، مگر ان کے فکر وخیال کی بالیدگی نے مستقبل کی اردو شاعری پر بالعموم اور اردو نظم پر بالخصوص بہت دور رس اثرات مرتب کیے ہیں۔ جن کے ثمرات کو آج اکیسویں صدی کی شاعری میں بھی دیکھا جا سکتا ہے۔ ایک عمومی رائے یہ بھی ہے کہ قسطنطنیہ کی فتح اور خلافت اسلامی کا عثمانی دور ایک فکری دھارے کے مطابق جدیدیت کے آغاز کے ابتدائی نقوش ہیں جنہوں نے عالمی سطح پر سیاسی سماجی اور معاشی مفادات کو نگاہ میں رکھتے ہوئے، نئے انسانی مزاج کے تعین میں اہم کردار ادا کیا۔ اردو ادب میں مجموعی طور پر جدیدیت کے مباحث انیسویں صدی میں انگریزوں کے ہندوستان سے شروع ہوتے ہیں۔ یاد رہے یہاں جدید کے معنی مخصوص مغربی فلسفیانہ تناظر نہیں بلکہ شاعری میں موضوعی اور انسانی سطح پر تبدیلی کے ڈسکورس کا نئے سرے سے قیام ہے۔ جدیدیت نظم کے لباس میں ایک پیچیدہ، زندگی آمیز، قدامت سے الگ تخیل بنیاد استغراق ہے جس نے اسلوبیاتی تنظیم کی نئی ترتیب سے شعری موضوع کو نظم کیا۔ جدید افکار کی صورت میں جو نئے ادبی ثقافتی فلسفیانہ لسانیاتی معاشی معاشرتی تصورات برطانوی سرزمینوں سے ہندوستان کے قرب وجوار میں آئے ان کی حقیقی جڑیں مغربی فکر وخیال کی بنیادوں میں پیوست ہیں مگر یہ اپنے تخیلی تجربے کے ساتھ عقلی اور درا کی کارکردگی بھی ہے جو قدیم شاعری کی طے شدہ اقدار سے ہٹ کر اپنے لیے نئی اقدار کا تعین کرتی ہے۔ یہ نئی فکری روایت اردو ادب کو حقیقی معنوں میں راج دربار کی غلام

گردشوں سے باہر نکل کر عام آدمی کی زندگی اس کے روز و شب اور اس کی روزمرہ نفسیات کو بیان کرنے کی راہ پر گامزن کرتی ہے۔ اپنے فکری لباس میں یہ جدید روشن خیالی بھی انگریز راج کے ہندوستان پر قبضے اور ہندوستانی معاشرت کے مغربی تعلیمی ثقافتی نظام سے متاثر ہونے کے سبب سے وقوع پذیر ہوتی ہے جس کے باطن میں استدلالی تجربے اور مشاہداتی احساس کی رو اپنی دھیمی ے کے ساتھ بہتی ہ ء جو کبھی تو بپھر کر ایک طوفان کی صورت اپنا لیتی ہے اور کبھی اپنی لے میں مگن گیت پرور ندی کے مانند ہو جاتی ہے۔ مغربی ملکوں میں جدید ادب کی تحریک تین سو سال پرانی ہے۔ اردو میں جدید ادب کا سلسلہ اپنی روایت کی تلاش میں ایک سو پچاس برس تک پیچھے کہ طرف جاتا ہے۔ تین سو برس کے طویل عرصے میں پنپنے والے انگریز استعماری ادب نے، اپنی فنی فکری موضوعی ہیتی جمالیات سے نصف حیات پر قائم ہمارے ادب کو کئی طرح سے متاثر کیا۔ کبھی کوئی فکر سامنے آئی تو کبھی کوئی کبھی ایذرا پاونڈ کی تمثالوں نے اردو میں ڈسکورس قائم کیا تو کبھی باختن کی ہیت پرستی شعری رسمیات میں نئے مباحث کھولنے کا دروازہ ثابت ہوئی۔ ایک خیال نے لسانیات کو پیش کیا تو دوسرے خیال نے لسانی مباحث کو رد کیا تو تیسرے خیال نے ساختیات کی بنیاد رکھی تو آئندہ خیالات نے ساختیاتی پیراڈائم کو سرے سے رد کر دیا۔ کہیں مصنف کی موت کا اعلان ہوا تو کسی جگہ تخلیقی متن کو دیگر تمام ذرائع پر فوقیت دے دی گئی۔ اس طرح مغربی جدیدیت میں ایک سے بڑھ کر ایک فکری بحث اور سوچنے، لکھنے کے نئے نئے طریقے سامنے آئے یہاں تک کہ استعمار زدہ مشرقی عوام کے حقوق کی جنگ لڑنے کا اہتمام بھی مغربی مصنفین نے مابعد نوآبادیات اور رد استعماریت جیسے موضوعات کے توسط سے پیش کیا۔ اردو میں ابھی تک انگریزی ادب سے آئے ہوئے سیاسی، سماجی، فلسفیانہ رجحانات کم عمر ہی نہیں ہیں نا پختہ کار بھی ہیں۔ یہ بھی حقیقت ہے کہ اردو ذہن اپنی فکری فنی تخیلی منطقی اور تفاعلی حالت میں ابھی تک فہم و فراست کی ان سطحوں کو نہیں چھو سکا جن پر مغربی ادب گزشتہ تین صدیوں سے براجمان ہے۔ اردو کا ادب آج بھی پرانے، کلاسیکی، اخلاقیاتی اور اقداری اثرات کا حامل ہے۔ یہ بھی سچ ہے کہ کسی بھی قوم گروہ یا جماعت اپنے سیاسی سماجی تفاعل بطور مجموعی نہیں بلکہ انفرادی طور پر یا معاشرے کے کسی ایک فرد یا کسی ایک مخصوص گروہ کا ذہن جدید خطوط پر استوار ہو کر غور و فکر شروع کر بھی دے تو قوم کے پورے مزاج کی تبدیلی میں صدیوں کا عرصہ لگ جاتا ہے کہ انفرادی تجربے اور اجتماعی تشخص کی تشکیل میں کئی طرح کی متفرق پیچیدہ صورتیں مضمر ہوتی ہیں اور ہر قوم تاریخ کے مختلف ادوار میں اس نوعیت کی اپسٹیم سے دوچار رہتی ہے۔

بیسویں صدی کو عام معنی میں صنعتی انقلاب اور سائنسی حیرت ناکی کی صدی قرار دیا جاتا ہے۔ اس صدی میں طویل باہمی تعاملات کا باہمی سفر دیکھتے ہی دیکھتے دنوں اور مہینوں میں مکمل ہونے لگا۔ گزشتہ پچاس سال میں جدیدیت کے بہت سے رنگ اور روپ اردو ادب میں ظاہر ہوئے ہیں۔ اسی جلد بازی کی وجہ سے اردو میں جدید رجحانات واضح نہیں ہیں۔ جدیدیت کے حوالے سے آل احمد سرور لکھتے ہیں:-

"ادب میں جدیدیت کے واضح تصور کی ایک خاص اہمیت یہ ہے کہ پہلے جو کام مذہب یا فلسفہ بڑی حد تک انجام دیتا تھا، اب یہ دونوں کے بس کا نہیں رہا۔ ہاں ادب اس خلا کو پر کرنے کی کوشش کر رہا ہے جو مذہب یا فلسفیانہ نظاموں کی گرفت کے ڈھیلے ہونے سے پیدا ہوا ہے۔ ادب اس خلا کو پر کر سکتا ہے یا نہیں یہ ایک علیحدہ سوال ہے لیکن اس میں شک نہیں کہ سائنس اور ٹیکنالوجی کی ترقی نے عقائد میں بڑے رخنے پیدا کئے ہیں اور جہاں اس نے بے پناہ علم، بے پناہ طاقت بے پناہ تنظیم، خاصے بڑے پیمانے پر یکسانیت، نئے نئے ادارے ایک عمومیت اور ایک آفاقیت پیدا کی ہے، وہاں بہت سی نئی مشکلات، نئی الجھنیں نئے خطرے اور نئے وسوسے بھی دیے ہیں۔ سائنس اور ٹیکنالوجی سے جو کلچر پیدا ہوا ہے، اس نے مشین سے کام لے کر انسان کو بہت طاقت اور بڑی دولت عطا کی لیکن اس نے انسان کے اندر جو جانور موجود ہے اس کو رام کرنے میں کوئی نمایاں کامیابی حاصل نہیں کی۔ یہ تمام تر سائنس اور ٹیکنالوجی کا قصور نہیں ہے کیونکہ سائنس اور ٹیکنالوجی اس معاملے میں غیر جانب دار ہے مگر جب اس نے پرانی بندشوں کو ڈھیلا کیا، پرانے عقائد اور نظریات پر ضرب لگائی تو نئے فتنوں کو بھی جنم دیا۔ پھر اس نے عقل کی پرستش ایک میکانکی انداز سے کی اور اس چیز کو نظر انداز کیا جسے بعض فلسفی حیات بخش عقل اور اقبال عشق کہتے ہیں۔ اس نے

باطن اور اس کے اسرار کی اہمیت کو محسوس نہیں کیا۔ اس نے محنت کے ساتھ تفریح کے مواقع بھی پیدا کئے اور تفریح کو سستے ہیجان یا بے معنی مصروفیت کے لئے وقف کر دیا۔ جیسے جیسے تفریح کی ضرورت بڑھتی گئی ویسے ویسے تفریح ایک ایسا زہر بنتی گئی جو بالآخر ذہن کی صحت کو مجروح کر دیتا ہے"(۱)

آج کا سب سے اہم سوال یہ ہے کہ جدیدیت کے معنی کیا ہیں۔ وہ کون سے لفظ ہیں جو جدید ہیں۔ وہ کون سے موضوعات ہیں جو اپنی اساس، اپنی پیشکش اپنی موضوعی، ہیتی، فنی اور فکری پیش کاری میں جدید ہیں۔ سوچنے کے کس طریقے کو جدید طریقہ مانا جاتا ہے یا تسلیم کیا جا سکتا ہے۔ وہ کون سا خاص رنگ ہے جو جدید نظم اور شاعری میں رائج ہو گا تو وہ جدید شاعری ہو گی وگرنہ اس خاص رنگ اور لب و لہجے کے بغیر شاعری جدید شاعری کہلانے کے لائق نہیں ہو گی؟ جدید نظم اور پرانی نظم میں کیا فرق ہے۔ جدید نظم لکھنے والا شاعر اور قدیم نظم لکھنے والا شاعر کس طرح سے ایک دوسرے سے جُدا، مختلف اور ایک سے دوسرے جیسا نہیں ہوتے ہیں۔ یہ ایک جیسے ہوتے ہیں یا نہیں؟ یہ دونوں تخلیقی کردار اپنی اپنی تخلیقی ڈومین میں ایک طرح سوچتے ہیں یا نہیں؟ یہ دونوں تجرباتی، مشاہداتی، احساساتی، فنی اور فکری سطح پر ایک جیسے یا ایک ہی تجربے سے گزرتے ہیں یا ان کے سب کام الگ الگ ہوتے ہیں- کیا ان دو طرح سے سوچنے والے لوگوں کا شعریاتی فہم ایک جیسا ہوتا ہے یا یہ شعوری یا لاشعوری سطح پر شعریات کے مختلف تصورات کے پیش کار ہوتے ہیں۔ حقیقیت یہ ہے کہ ان مباحث سے آگاہی حاصل کرنے کے لیے پہلے مرحلے پر جدیدیت کو بطور اصطلاح اور بطور موضوع سمجھنا لازم ہے۔ جدیدیت اپنے آپ میں اپنے مزاج آہنگ اور پیشکش کے حوالے سے ایک خاص احساس کا نام ہے۔ جدید ذہن تنہائی کا شکار ہونے کے علاوہ کنفیوز اور اکیلا ہے۔ یہ انسان اپنی زندگی کی مشکلوں کا مقابلہ تنہائی اور اکیلے پن کے احساس کے ساتھ کر رہا ہے۔ اس لیے جدید شاعری اور قدیم شاعری میں انسان کی سیاسی سماجی دیہی شہری تمدن و معاشرت کا فرق نمایاں ہے۔ خواہ وہ شاعری نظم میں ہو خواہ وہ شاعری غزل میں ہو۔ جدید شاعروں نے لفظ اور موضوع ہی نہیں بلکہ ہندوستان میں صدیوں سے رائج عروضی پابندیوں کو بھی تہہ و تیغ کیا اور اردو شاعری کو بحور و اوزان کے ایک بالکل نئے نظام سے آشنا کیا جس نے اس نظام کے تصور شعر اور شاعری جی رسمیات کو بڑے پیمانے پر بدل کر رکھ دیا۔ جدید نظم اپنے اندر سے قدیم

نظم سے مختلف ہے۔ نظیر اکبر آبادی کی نظم، اکبر الہ آبادی کی نظم، علامہ محمد اقبال کی نظم، اختر محمود شیرانی کی نظم۔ یہ سب لوگ ایک دوسرے سے مختلف شاعری کرتے ہیں۔ مگر یہ الگ الگ شاعری ایک جیسی ہے۔ اس میں انسان کا خاص تصور پایا جاتا ہے۔ اس میں قصہ کہانی والی زندگی کے کردار ملتے ہیں۔ یہ شاعری خاص ماحول کو پیدا کرنا چاہتی ہے۔ اختر محمود شیرانی ان میں واحد آواز ہے جس نے پہلے کی تمام آوازوں کو رد کر کے متوسط طبقے کی حسین و جمیل اور جنسی و شہوانی سطح پر پر کشش عورت کو اولا اپنا موضوع بنایا وگرنہ اردو نظم کا مجموعی مزاج، مذہبی اصلاحی اور شریفانہ اطوار پر بنیاد تھا۔ جسے حافظ محمود شیرانی کے بادہ نوش صاحب زادے نے پارا پارا کر کے خاص طرح کی جگہ پر سے بیان کیا ہے۔ جہاں عورت مغنیہ نہیں اور نہ ہی تھرکتے پیروں سے عاشق کے دل و دماغ پر قابض ہے بلکہ یہ وہی عورت ہے جسے فرط جذبات میں حسرت موہانی "ننگے پاوں کوٹھے پہ" لے آئے تھے۔

جب آپ جدید نظم پڑھیں گے تو آپ کو مثنوی کی فضاء سے باہر نکلنا ہو گا۔ یہ نظم عمومی کلاسیکی نظم کی روایت کے بالکل برعکس ہے۔ اس میں وہ سب عناصر نہیں ہونگے جن کا اہتمام مثنوی نگار شعرا کے ہاں کیا جاتا تھا کیونکہ جدید نظم داستان کی فضاء سے مبراء ہے۔ اس میں جدید زندگی کی پیچیدگی، ابہام، نفاق اور نارسائی کی خفیف کسک ہے۔ اس میں جدید معاشرے کا وجود ہے۔ جدید شاعری کی زبان اور تکنیک قدیم شاعری کی زبان اور تکنیک سے مختلف ہے۔ اس کی علامتیں جدید ہیں۔ اس میں عاشق محض تصور سے عشق نہیں کرتا بلکہ یہ جسم سے بھی عشق کرتا ہے یہ جنسی تجربے سے گذرنا چاہتا ہے یہ دیوی اور پری سے عشق و محبت کرنے کی بجائے گوشت پوست کی پر کشش اور جنسیت سے بھری عورت سے محبت کرتا ہے اور اس کے وجود کی ہر اکائی سے مکالمہ کرنے کے ساتھ ساتھ اس کی توصیف و ستائش کا خواہاں ہے۔ جدید شاعری کا معاملہ پیچیدہ شاعری کا معاملہ ہے وہی پیچیدہ نفسیات جو بیسویں صدی کے بعد انسان کی روزمرہ زندگی میں شامل ہو گئی۔ اس لیے جدید نظم منفرد ہے۔ جس میں شخصی رنگ پایا جاتا ہے۔ اس کے مزاج میں ظرافت اور طنز نمایاں ہوتا ہے۔ ایک حقیقت یہ بھی ہے کہ جدید اردو نظم کو اپنی ابتداء کے ساتھ ہی کئی طرح کی مخالفتوں کا سامنا کرنا پڑا۔ غزل گو شعرا آزاد نظم میں میسر عروضی سہولت کو شاعری سے خارج قرار دینے لگے۔ آزاد نظم کو بے وزن شاعری بھی قرار دیا گیا مگر جدید نظم نے اپنے موضوعات آہنگ، ارتکاز، صوتی تنافر، عضواتی فعلیت اور دوسری خوبیوں کی وجہ سے اردو شاعری کے میدان میں بہت جلد اپنے لیے جگہ بنالی۔ حتٰی کہ نظم کے حامیوں نے غزل میں ردیف قافیہ کی پابندی کو اس کا نقص

قرار دے دیا۔ انہوں نے وضاحت کی کہ جدید نظم میں زندگی کے بدلتے ہوئے معیارات کو بیان کیا جا سکتا ہے۔ غزل چونکہ موسیقیت کی وجہ سے معروف ہوئی۔ اس میں ردیف قافیہ کی پابندی لازمی ہے۔ اس طرح یہ صنف کئی طرح سے جدید زندگی کے اجزاء کو بیان کرنے سے قاصر ثابت ہونے لگی کہ غزل کے دو مصرعوں کی خوبی ہی اس کی خامی ٹھہری جس میں زندگی کی تلخی اور پیچیدگی کو اس طرح بیان نہیں کیا جا سکتا جس طرح راشد نے "ریگ دیروز" اور مجید امجد نے "طلوعِ فرض" میں بیان کیا ہے۔ غزل کا ایک شعر زندگی کو میراجی کی "کلرک کا نغمہء محبت" اور فیض احمد فیض کی "رقیب سے" کی طرح پیش کرنے کی صلاحیت سے قاصر ہے۔ جدید نظم نے انسانی وجود اور اس وجود کے موجود کا اثبات تلاش کرنے کی کوشش کی ہے۔ اس نے انسانی لایعنیت اور کائناتی بے معنویت کو اپنی تخلیقی کائنات کا موضوع بنایا ہے۔ غزل پر ہونے والے ان اعتراضات کو شہزاد منظر نے یوں بیان کیا۔

> "قیام پاکستان کے فوراً بعد یہ بحث چھڑ گئی کہ غزل کا دامن اس قدر تنگ ہے کہ وہ صنعتی عہد کے مسائل اور تقاضوں اور درد و کرب کو بیان کرنے کی صلاحیت نہیں رکھتی یا وہ دور حاضر کی صنعتی اور سائنسی تہذیب کی ترجمانی کا حق ادا نہیں کر سکتی" (۲)

اگر اس پہلو کو غیر جانبداری سے پرکھا جائے تو اس کے کئی زاویے ہیں اور حقیقت ہے کہ جدید نظم نے زندگی کو جس باریکی اور پارا پارا شکل میں دیکھا ہے اور جس طرح چھلنی کر کے قاری کے سامنے پیش کیا ہے اس کی مثالیں نہ تو داستانوی ادب میں ملتی ہیں اور نہ ہی مثنوی سمیت نئی نظم کے کئی ذائقوں میں دکھائی دیتی ہیں۔ جدید نظم کے باب میں اردو شاعری نے مغربی شاعری سے سانیٹ، نظم معریٰ (بلینک ورس) اور آزاد نظم کو بالخصوص قبول کیا۔ چین سے ڈاکٹر محمد امین تین مصرع نظم ہائیکو بھی لے آئے مگر اسے وہ اہمیت حاصل نہ ہو سکی جو جدید آزاد نظم نے اردو شعر و ادب میں حاصل کی کیونکہ زمینی حالات کے معروضی تقاضوں کے ساتھ ساتھ جدیدیت نے اردو تخلیق کار کو ذہنی سطح پر یوں بھی متاثر کیا کہ تخلیق کار اس جدت پسندی کو شعوری سطح پر اور بطور شوق اپنائے، اس غیر فطری اور تیز رفتار عمل کا حاصل فنکارانہ تجربے و مشاہدے میں گہرائی و گیرائی کے برعکس فطری عجلت اور داخلی ترغیب نے جگہ بنانا شروع کر دی جس کے سبب سے تخلیقی تجربہ خاص طرح کی سطحیت سے دوچار ہونے لگا اور اس عمل نے بحثیت مجموعی شاعری کی فضاء اور معیار

دونوں کو نقصان پہنچایا۔ ڈاکٹر شمیم حنفی اپنی کتاب جدیدیت کی فلسفیانہ اساس میں جدید فکر کے اجزاء کے بارے میں رقم طراز ہیں۔

> "ہندوستان میں انیسویں صدی کی ذہنی فضاء نے جس جدید حقیقت کی تلاش کی، اس کی منزل بھی طے تھی اور راستہ بھی۔ رہنمائی کرنے والے نئے خیالات کے نقیب، مذہبی مصلح اور سماجی معمار تھے۔ شعر و ادب کی رہبری بھی انھی کے ہاتھوں میں آئی اور انہوں نے نئے انسان کی سماجی ضرورتوں کے شور میں، نئے خیالات کی روشنی سے، سراسیمہ ہو کر اس کے جذباتی اور حسی تقاضوں اور تصادمات کی طرف سے آنکھیں بند کر لیں۔ یہی سبب ہے کہ جدید شعری یا ادبی روایت کی خاکہ کشی نئے تعلیمی نظام، نئے کالجوں کے قیام، نئے خیالات کی کامرانی اور نئے سماجی معماروں کے تسلط کی بنیاد پر کی جاتی ہے"(۳)

جدیدیت کا بڑا موضوع سیاسی، سماجی حالات کی پیشکش ہے۔ اردو شاعری کی روایت میں جدید نظم نے اس معاشرتی عمل کو خوبی سے سرانجام دیا ہے۔ نظیر اکبر آبادی کی نظم میں دیکھیں تو پتہ چلتا ہے کہ وہ اپنے سیاسی سماجی نظام سے جڑا ہوا شاعر ہے۔ اس کی نظم میں ہر طرف سیاسی صورت حال کی پیش کش ہے۔ بھوک کا مارا "روٹی نامہ" میں بیان کیا گیا ہے۔ انسان نے آخر مر جانا ہے۔ اس کا سارا مال دولت گاڑیاں ڈالر پیسہ زمین جائیداد بیوی بچے سب یہیں فانی دنیا میں رہ جائیں گے۔ نظیر اس سچائی کو "بنجارانامہ" میں بیان کرتا ہے۔ اس کے سامنے ہندو ہیں، اس کے سامنے سکھ ہیں، مسلمان ہیں۔ نظیر اکبر آبادی کے لیے یہ سب کے سب آدمی اور انسان ہیں۔ ان میں کوئی فرق نہیں ہے۔ ان سب کرداروں کی زندگی میں فرق ہے۔ ذہن کی حالت میں فرق ہے۔ مال اور دولت میں فرق ہے مگر یہ سب انسان اصل میں تو ایک ہی خدا کے پیدا کیے ہوئے انسان ہیں۔ اس حقیقت کو نظیر اکبر آبادی نے اپنی نظم "آدمی نامہ" میں کھل کر بیان کیا ہے۔ ہندوستان میں انگریزوں کی لوٹ کھسوٹ سے جو برے حالات پیدا ہوئے۔ انگریز کپاس کے کھیتوں سے سفید سونا بحری جہازوں میں لے کر جا رہے تھے۔ اس وقت ہندوستان کا عام آدمی مفلسی میں گھرا ہوا تھا۔ اس کے پاس دو وقت کا کھانا کھانے کی ہمت

نہیں تھی۔ اس کے جسم کی ہڈیاں نکل آئی تھیں۔ وہ ہر وقت گورے مالک کے سامنے سر جھکا کر کھڑا رہتا تھا ان سارے حالات کو نظیر اکبر آبادی نے اپنی نظم "مفلسی" میں بیان کیا ہے۔ نظیر اکبر آبادی کے اسی سیاسی اور سماجی شعور کی وجہ سے اردو ناقدین نے نظیر اکبر آبادی کو عوامی شاعر قرار دیا ہے۔ سید طلعت حسین نقوی اپنی کتاب نظیر اکبر آبادی کی نظم نگاری میں لکھتے ہیں۔

"ہر فن پارے کا تعلق فنکار کی شخصیت سے بہت گہرا ہوتا ہے۔ خواہ وہ فنون لطیفہ کا کوئی فن پارہ ہو یا صنعت کا کوئی کارنامہ۔ ساتھ ہی ساتھ یہ بھی عین فطرت ہے کہ فنکار کی شخصیت اس کے گردوپیش کے ماحول اور وقت کے تقاضوں کا نتیجہ ہوتی ہے۔ اس طرح کسی بھی فن پارے میں فن کار کے مشاہدے اور تجربے کا گہرا عکس دکھائی دیتا ہے اور وہ فن پارہ نہ صرف فن کار کے بلکہ اس کے عہد و زمانے کے مزاج کا غماز بھی ہوتا ہے۔ اس طرح جیسے جیسے زمانے کا انقلاب کسی شخص کے مزاج کو تبدیل کرتا جاتا ہے اسی طرح بتدریج کسی شاعر یا مصنف کی تخلیقات میں موڑ آتے جاتے ہیں۔ اس طرح ہر شاعر کے کلام میں یہ اتار چڑھاو واضح طور پر دیکھے جاسکتے ہیں۔ نظیر اکبر آبادی کی شاعری بھی اس اصول سے مستثنیٰ نہ رہ سکی۔ ان کی شاعری ان کے عہد کی منہ بولتی تصویریں ہیں۔ اردو شاعری میں نظیر کا عہد وہ پر آشوب زمانہ تھا۔ جب ہندوستان کی سیاست اور اونچے طبقوں کی زندگی زوال بکنار ہو رہی تھی۔ اورنگ زیب کے بعد مغلیہ خاندان کے گیارہ حکمران گزرے جنہوں نے غالباً ایک سو پچیس برس تک حکومت کی، یہ نکمے، کمزور اور عیش پرست حکمرانوں کا دور تھا۔ اس دور میں ملک کا معاشی نظام عدم توجہی کا شکار ہوتا گیا۔ نتیجہ کے طور پر انتشار اور بد امنی عام ہوئی اور ہر طرف قتل و

غارت اور لوٹ اور تباہی کا بازار گرم ہوا۔ مرکز کی کمزوری کا فائدہ اٹھاتے
ہوئے مرکز گریز قوتوں نے علم بغاوت بلند کر دیے"(۴)

جدید اردو شاعری کے آغاز وارتقا کا زمانہ ہندوستان کے سیاسی، معاشی زوال کا زمانہ ہے۔ یہ وہ عہد ہے جب کمزور شہنشاہ کے دربار کی تمام روایات دم توڑ رہی تھیں۔ ہر طرف افراتفری پھیلی ہوئی تھی۔ پورا ہندوستان ذہنی کشمکش میں مبتلا تھا۔ اس وجہ سے اردو شاعری میں دکھ، یاس، موت، ناکامی کے موضوعات نے اپنی جڑیں مضبوط کر لیں۔ یہ شاعری شاہی نظام کے زوال کو بیان کرتی ہے۔ اس میں صوفیانہ خیالات اپنے عروج پر دکھائی دیتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ اس شاعری میں وہ سب باتیں شامل ہو گئیں تھیں جن باتوں میں زندگی سے مقابلہ اور منزل کی طرف بڑھنے جد وجہد کرنے کا جذبہ نہیں تھا۔ یہ ضرور سچ ہے کہ آج کا شاعر اکیسویں صدی میں اپنے معاشرے کے حقائق کا کھل کر سامنا کرتا ہے۔ وہ اپنے گردوپیش کے حالات کو شاعری میں منتقل کرتا ہے۔ وہ ایک منزل پر پہنچنے کے لیے ہاتھ پاوں مارتا ہے۔ اس لیے جدید نظم میں زندگی کی ساری سماجی، سیاسی، معاشی، معاشرتی اور جنسی گھٹن موجود ہے۔ وہی گھٹن اور پریشانی جو اس عہد کی پہچان بنی ہوئی ہے۔ جدید نظم اپنے حالات سے مقابلہ کرتی ہوئی نظر آتی ہے۔ تصدق حسین خالد، ن م راشد، میر اجی، مجید امجد، فیض احمد فیض، اختر حسین جعفری، ضیا جالندھری، منیر نیازی، آفتاب اقبال شمیم، انیس ناگی، افتخار جالب، غلام جیلانی کامران، اختر الایمان، کیفی اعظمی، انوار فطرت، فرخ یار، اقتدار جاوید، روش ندیم، ارشد معراج، دانیال طریر، خوشحال ناظر، عامر عبداللہ سمیت کتنے اہم نام ہیں۔ یہ نام جدید نظم میں سماج اور معاشرت کی پیش کش میں بنیادی کردار ادا کر رہے ہیں۔ ان کی نظم معاشرتی تقاضوں سے ہم آہنگ ہے۔ یہ نئی صورت حال سے مقابلہ کر رہی ہے۔ اس میں آزادی اور خود مختاری کی چاہت ہے۔ یہ مغربی دباو میں نہیں ہے۔ ان شاعروں کے اندر زرخیز تخیل موجزن ہے۔ یہ اپنے عہد کی نمائندگی کرتی ہیں۔ یہ نظم اپنے معاصر عہد میں زندہ ہے اور اسی عہد میں سانس لیتی ہے۔ اس عہد کی اخلاقی قدروں کو بیان کرتی ہے۔ ان نظموں میں ہمارا معاشرہ زندہ ہے۔ ان نظم نگاروں نے ہمارے سماجی حالات کو بیان کیا ہے۔ ان نظموں میں آج اور کل کے تمام رنگ موجود ہیں۔ ماضی اور حال کے تمام رشتے دکھائی دیتے ہیں۔ اسی جدید نظم کے حوالے سے احتشام حسین لکھتے ہیں۔

"حب الوطنی کے جذبات اور قومی ضروریات نے حاکم و محکوم کی کشمکش بڑھا دی تھی اور زندگی کے ہر شعبے میں اس کے اثرات نمایاں ہو گئے تھے۔ بیسویں صدی کے شروع ہوتے ہوتے انگریزی تعلیم کافی پھیل چکی تھی، ذرائع آمد و رفت میں ترقی ہوئی تھی، متوسط طبقے نے حکومت کا بوجھ اپنے کاندھوں پر کسی قدر اٹھالیا تھا اور انہیں اس کا احساس ہو رہا تھا کہ انہیں اور ان کی اولاد کو اور حقوق ملنے چاہئیں۔ ملک کے کچھ سر پھروں نے قومیت کا تصور بھی پیش کیا تھا، اس لئے معمولی پیمانہ پر جماعتی ترقی کے تصورات بھی پیدا ہوئے اور متوسط طبقہ نے کونسلوں اور اسمبلیوں میں، سول سروس میں اپنے لئے زیادہ جگہیں پانے کی کوشش شروع کی، وہ قومیت اور وطن پرستی کی راہ میں تھوڑی دور جاسکتے تھے زیادہ نہیں۔ بہت تھوڑے سے لوگ دنیا کی دوسری ترقی پسند تحریکوں سے باخبر ہو کر ہندوستان کے سیاسی حالات کو دوسرے پس منظر میں دیکھ رہے تھے۔ اکبر الہ آبادی، شاد عظیم آبادی اور چکبست سب متوسط طبقے کے ترجمان ہیں۔ اکبر کو مغربی تہذیب سے نفرت تھی۔ بعض اوقات تو ایسا معلوم ہوتا ہے کہ وہ ہر اس چیز سے نفرت کرتے تھے جو زندگی کی کشمکش میں نئی معلوم ہو رہی تھی لیکن جس طرح اکبر نے سیاسی حالات کو سمجھا تھا، اس طرح کم لوگ سمجھتے ہیں اور جس طرح انہوں نے ان مسائل کو اپنی شاعری کا جز بنایا اس طرح اور کوئی نہ بنا سکا۔ چکبست نے قومیت اور حب وطن کا پرجوش نعرہ لگانے کے بعد بھی سب کچھ اپنے طبقاتی مفاد کے دائرے کے اندر ہی سوچا(۵)

جدید اردو نظم کی روایت اقبال کے تصور کے بغیر ادھوری اور نامکمل ہے۔ علامہ اقبال نے نظم کہہ کر اس میں موضوع اور علامتوں کے امکانات کو وسعت دی اور نظم کی مبادیات کو موجود کی نسبت سے مزید اعلیٰ کر دیا۔ علامہ اقبال کی

نظم نگاری میں ہیئت کا تو کوئی تجربہ نہیں کیا گیا مگر علامہ محمد اقبال نے اپنے جدید موضوعات اور تصورات کی زرخیزی سے اردو نظم کی مدد سے انسان خدا اور کائنات کے مابین رشتہ بنانے کی کامیابی سے کوشش کی۔ اس طرح علامہ اقبال نے شاعری میں فلسفے کے تخلیقی بیان سے آنے والے شاعروں کے لیے نئی راہیں کھولیں۔ اقبال نے اردو شاعری میں پہلی مرتبہ غیر مادی اور ورائی سوالات اُٹھائے جس کی وجہ سے نظم میں موضوع کے حوالے سے نئے راستوں کا تعین ہوا۔ اقبالؔ کو اپنے پیش رووں سے نظم کی جو روایت ملی اس کے سرمائے میں نظیر کی نظموں کے علاوہ حالی، آزاد، اسماعیل میرٹھی اور اکبر کی نظم نگاری کے فن کی ڈھیلی ڈھالی روایت تھی۔ وہ پیامی، مقصدی، اصلاحی اور اخلاقی شاعری کا دور تھا اور براہ راست بات کہنی ضروری سمجھی جاتی تھی۔ اقبالؔ نے شاعری کی شروعات رواج کے مطابق غزل اور رومانی غزل سے کی مگر بہت جلد نظموں کی طرف متوجہ ہوئے کیونکہ پیامی نقطہ نظر سے یہ صنف اظہار خیال کے لئے زیادہ کار آمد تھی۔ انہوں نے فارسی کی طرح اردو میں طویل نظمیں نہیں لکھیں مگر اردو میں ان کی مختصر اور نسبتاً طویل نظموں کی تعداد کیفیت اور مقدار دونوں کے لحاظ سے اتنی ایک ہے کہ اقبال کو اب تک اصلاحی اور قومی نظم کے سب سے بڑے شاعر کے زمرے میں شمار کیا جاسکتا ہے۔ اقبال نے اردو نظم کو جو وسعت، گہرائی، بعد اور فکری رفعت عطا کی ہے اس سے انکار کفر ہو گا۔ اقبال کی نظم خطاب بہ جوانان اسلام ملاحظہ کریں۔ کہ کس طرح شاعر نے انفعالیت زدہ معاشرے کے نوجوان کو ماضی کے جھروکوں سے آشنا کر کے مستقبل کی تیاری پر مائل کیا ہے۔ اقبال کی شاعری کا یہی اسلامی تہذیبی تناظر ہی اسے محدود بھی کرتا ہے۔ اقبال انسان سے نہیں مسلمان سے گفتگو کر رہا ہے وہ حرکت کی خواہش کا اصرار بھی انسان سے نہیں بلکہ مسلمانوں سے کر رہا ہے۔ اقبال کا خواب پر امن انسانی معاشرہ نہیں بلکہ مثالی اسلامی معاشرہ ہے۔ اس کے برعکس مجید امجد، میراجی، ن م راشد کے ہاں انسان کو جو مرکزیت حاصل ہے وہ کسی اور شئے کو نہیں۔ راشد استعمار کے تصور سے اپنی سیاسی اور معاشرتی صورت حال کو بیان ضرور کرتا ہے مگر مذہب کے دائرے میں رہ کر بھی وہ اس دائرے سے باہر بھی رہتا ہے۔ اس کے مقابل روسی ہیں، افرنگی ہیں، تیل کے سوداگر ہیں مگر عیسائی یہودی نہیں نہ ہی وہ کسی مذہب کی مذمت کرتا ہے سوائے اس کے کہ اس کے ہاں مسلمانوں کی زبوں حالی کا قصہ کچھ الگ طرح سے رقم ہے جس کے بیان میں خاص غصہ اور بدمزاجی داخل ہو جاتے ہیں۔ "بانگ درا" کے دیباچے میں مدیر مخزن سر عبدالقادر نے اقبال کے فکر و فن کے بارے میں کچھ یہ لکھا:

> "یہ دعویٰ سے کہا جا سکتا ہے کہ اردو میں آج تک کوئی ایسی کتاب اشعار کی موجود نہیں ہے۔ جس میں خیالات کی یہ فراوانی ہو اور اس قدر مطالب و معنی یک جا ہوں۔۔۔۔ بعض نظموں میں ایک ایک شعر اور ایک ایک مصرع ایسا ہے جس پر مستقل مضمون لکھا جا سکتا ہے"(۶)

علامہ اقبال کی عظمت کے لیے یہ کم نہیں کہ انہوں نے اردو نظم کو اپنے موضوع اور انداز بیان کی وجہ سے دولت مند کیا۔ علامہ محمد اقبال کی شاعری انگریزی کی غلامی میں پھنسے مسلمانوں کی روح میں اترتی ہے۔ اسی وجہ سے وہ بہت جلدی بہت زیادہ مشہور ہو گئے۔ ان کا کلام رسالوں میں شائع ہوا۔ علامہ محمد اقبال نے مشاعرے پڑھے۔ ہر جگہ انہیں بہت زیادہ داد ملی۔ ان کا کلام ہندوستان میں مسلمانوں کے علاوہ لوگوں نے بھی پسند کیا۔ اقبال نے اپنی نظم کے پیرائے میں تاریخ اسلامی سے استفادے کے باوجود اپنے عہد کے سیاسی سماجی منظرنامے کو بیان کیا ہے۔ ایک طرف جمہوریت ہے۔ ایک طرف سرمایہ داری کا عفریت ہے۔ ایک طرف شریعت محمدی ہے۔ اقبال اس سماجی معاشرتی ماحول میں ہمیشہ اسلام کی بلندی کے لیے کوشیش کرتے رہے ہیں۔ اقبال کی نظم میں انسان کے بارے میں ڈاکٹر انوار الحق لکھتے ہیں:

> "اقبال کی رائے میں انسان کے اعمال اس کی خودی کو مضبوط بھی کرتے ہیں اور ہلاکت کا باعث بھی بنتے ہیں یعنی خودی کی بقا اور فنا انسانی اعمال پر منحصر ہے۔ اگر خودی اپنے اعمال کی بدولت اپنے اندر اتنا استحکام پیدا کر لے کہ موت اسے کوئی نقصان نہ پہنچا سکے تو ایسی صورت میں موت اس کے لیے در حقیقت ایک راستہ ہے۔ اس راستے کو قرآن پاک نے "برزخ" کے نام سے یاد کیا ہے"(۷)

شوریٰ کے معنی بڑی سطح پر قانون ساز ادارہ ہونا ہے۔ اس ادارے یا اس میں شامل افراد کے فیصلے پوری قوم پر اثر انداز ہوتے ہیں۔ ابلیس کی مجلسِ شوریٰ میں اقبال نے واضح کیا ہے کہ اس عہد میں سیاسی سماجی زندگی کو شیطان اور شیطان کے چیلوں کی مدد زے گذارا جا رہا ہے۔ ڈاکٹر انوار الحق کی بات سے یہ نقطہ واضح ہو جاتا ہے۔ علامہ اقبال جدید دنیا میں مسلمان قوم کی بے کسی پر آنسو بہاتے ہیں۔ اس بے کسی اور غلامی کی وجہ مسلمانوں کا اپنے دین اور عقائد سے دور ہونا

ہے۔ مسلمان دین محمدی کے برعکس ابلیسی نظام کا حصہ بن چکے ہیں۔ علامہ اقبال کی نظم اپنے عہد کے سیاسی سماجی نظام کا بہترین اظہار ہے۔

اردو ادب میں جدید نظم نگاری کے حوالے سے شہزاد منظر لکھتے ہیں:

> "آزادی سے پہلے ترقی پسند تحریک کے زمانہء عروج میں جس صنف سخن وہ سب سے زیادہ مقبولیت حاصل تھی وہ نظم تھی-اس لیے کہ ترقی پسند موضوع کے لیے نظم زیادہ موزوں اور قابل قبول تھی-اس کی وجہ یہ تھی کہ اس کت ذریعے قارئین اور سامعین تک پیغام رسانی آسان تھی۔ خواہ یہ پیغام سیاسی نوعیت کا ہو، جدوجہد آزادی کے بارے میں ہو یا معاشرتی اصلاح کے لیے دیکھا جائے تو اردو میں جدید شاعری کے معنی ہی نظمیہ شاعری کے ہیں- جدید نظم نگاری کا دور خواجہ حالی کے زمانے میں شروع ہوتا ہو یا اقبال کے دور سے یا انجمن پنجاب کے زمانہ قیام سے یہ حقیقت ہے کہ تصدق حسین خالد، ن م راشد، میر اجی اور ان کے ہم عصروں نے بیسویں صدی کے تیسرے عشرے میں جب شاعری شروع کی تو وہ نظم نگاری ہی کا دور تھا(۸)

ادب کا ہر طالب علم گواہ ہے اور یہاں کوئی حوالوں کی ضرورت نہیں کہ اقبال کی شاعری کے بعد جو مقبولیت جدید نظم کو ملی وہ اردو شاعری کی کسی اور صنف کے حصے میں نہ آئی۔ ن م راشد، میر اجی، فیض احمد فیض سمیت کتنے نظم نگار ہیں جن کی شہرت کی وجہ جدید نظم بنی۔ ترقی پسند تحریک میں ساحر لدھیانوی اور فیض نے اپنے خیالات کے اظہار کے لیے جدید نظم کو ہی منتخب کیا اور میر اجی نے حلقہء ارباب ذوق کی ترقی اور ارتقاء کے لیے بھی جدید نظم اور یہاں تک کہ جدید نظموں کے بین الاقوامی شاعروں سے استفادہ حاصل کیا اور اردو کے شاعروں کے سامنے پوری دنیا کے نمایاں نظم نگاروں کے تعارف پیش کیے۔ ان کی نظموں کو اردو میں ترجمہ کیا(۹)

اس بیان میں ان لوگوں کے لیے سوچنے کے بہت سے پہلو ہیں جو شاعری کو بے کار چیز کہتے ہیں۔ اوپر یہ بتایا گیا ہے کہ جدید نظم سیاسی، قومی اور ملی جذبات کا اظہار کا بہترین ذریعہ ہے۔ اس کا مطلب ہے کہ جدید نظم میں ان جذبات کو بیان کیا جاتا ہے اور جس شئے کے مدد سے ملی اور قومی جذبات کو بیان کیا جائے وہ کس طرح سے بے کار یا ناکارہ ہو سکتی ہے۔ اس کے علاوہ کہ ہم اپنی کسی ذاتی اور نفسیاتی اور سنی سنائی پر شعر اور شاعری کو بے کار یا لغو قرار دے دیں۔ شاعری کی خوبی یہ ہے کہ یہ معاشرے کے پہلوؤں کو سامنے لاتی ہے انسان کے جذبات اور احساسات کو بیان کرتی ہے۔ تہذیب اور تمدن کے حوالے قلم بند کرتی ہیں۔ سماج میں جاری کئی مزاجوں کی نشاندہی کرتی ہے۔ قوم کے جذبات کی نمائندگی کرتی ہے۔ دین کے اجزاء کو بیان کرتی ہے۔ انسان کے اندر جاری کشمکش کو الفاظ دیتی ہے۔ انسان اور حیوانات کے درمیان فرق کو واضح کرتی ہے۔ جذبات کو لفظوں کا جامہ پہناتی ہے وغیرہ یہ فہرست بہت طویل ہے۔ جو چیز اتنے بہت سارے کام بخوبی انجام دے سکتی ہو اور دے رہی ہو اسے بے کار کہنا بالکل بھی درست نہیں ہے۔ شاعری کی اہمیت اور انسان کی زندگی میں اس کی لازمیت کے حوالے سے شہزاد منظر نے ڈارون کو نقل کیا ہے جس کا کچھ حصہ یہاں بیان کیا جارہا ہے تاکہ شاعری کے سیاسی سماجی ثقافتی تمدنی اور انسان کے اندر اور باہر ہونے والے اثرات کو سمجھا جاسکے:

> "تیس برس کی عمر تک بلکہ اس کے بعد تک، شاعری کی اکثر صنفوں میں مجھے بہت لذت ملتی تھی۔ جب میں مدرسے میں پڑھتا تھا اس وقت شکسپیئر کے کلام میں، خاص کر اس کے تاریخی ڈراموں میں بہت ہی لطف آتا تھا- میں یہ بھی کہہ چکا ہوں کہ مجھے تصویروں سے کچھ اور موسیقی سے بہت زیادہ دل چسپی تھی- لیکن اب کئی سال سے ایک مصرع پڑھنا بھی میری قوت برداشت سے بہت باہر ہے۔ ابھی حال ہی میں میں نے شکسپیئر کا کلام پڑھنے کی بہت کوشش کی مگر وہ مجھے ایسا روکھا پھیکا اور اتنا بدمزہ معلوم ہوا کہ میرا جی متلانے لگا- تصویروں اور موسیقی کا شوق گویا بالکل باقی نہیں رہا ہے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ میرا دماغ ایک مشین ہو کر رہ گیا ہے جس کا کام یہ ہے کہ حادثات اور واقعات کو جمع کر کے ان سے عام اصول اخذ کرے- مگر میری

> سمجھ میں نہیں آتا کہ میرے دماغ کا صرف وہی حصہ کیوں بے کار ہو گیا ہے جس پر لطیف احساسات کا دار و مدار ہوتا ہے------امریکا کا مشہور ماہر نفسیات پروفیسر جیمس لکھتا ہے کہ ڈارون کے اس بیان سے لوگوں کو سبق لینا چاہیے اور ہر شخص جو کم از کم دس منٹ روز شعر و شاعری کے لیے وقف کر دینے چاہیں تا کہ جذبات مردہ نہ ہونے پائیں(۱۰)

اوپر کی ہوئی باتیں کسی عام آدمی کی نہیں بلکہ ایک بہت بڑے سائندان اور ایک مشہور نفسیات دان کی ہیں۔شاعری کے بارے میں تعریف کے یہ لفظ کسی شاعر یا شاعروں کے خیر خواہ نے نہیں لکھے بلکہ عام طور پر جن لوگوں کو شاعروں سے الگ قرار دیا جاتا ہے یعنی سائنس دان، ان کے کہے ہوئے ہیں۔ان الفاظ کے پیچھے ذہنی ریاضت اور تجربے کا نچوڑ موجود ہے۔کوئی بھی انسان اگر فطرت اور فطرت کے بے شمار اجزاء سے مسرت حاصل کرنا چاہے تو اس کے پاس شاعری سے بڑا کوئی ذریعہ موجود نہیں ہے۔یہ شاعری ہے جو انسان اور معلوم اور نامعلوم دنیاوں کی سیر کراتی ہے۔شاعر کا تخیل اور جذبات اتنے زور دار ہوتے ہیں کہ وہ پڑھنے والے جذبات کا حصہ بن جاتے ہیں۔دنیا کی ساری گہما گہمی رونق اور چہل پہل انسان کے جذبات کی مرہونِ منت ہے اور ان جذبات کو بہترین انداز میں شاعری بیان کرتی ہے۔شعر کے اثر اور اہمیت کے بارے میں مولانا الطاف حسین حالی مقدمہ میں "شاعری شائستگی میں قائم رہ سکتی ہے" کے باب میں لکھتے ہیں:

> "اگرچہ علم کی ترقی سے الفاظ کے معنی محدود اور بہت سی باتوں کی واقعیت کے خیال محو ہو گئے ہیں مگر زبانیں پہلے کی نسبت زیادہ لچکدار اور اکثر مقاصد کے بیان کرنے کیں زیادہ لائق ہوتی جاتی ہیں۔بہت سی تشبیہیں بلاشبہ اس زمانے میں بیکار ہو گئی ہیں مگر ذہن نئی تشبیہیں اختراع کرنے سے عاجز نہیں ہوا۔یہ سچ ہے کہ سائنس اور مکینکس جو شیلے خیالات کو مردہ کرنے والے ہیں لیکن انہی کی بدولت شاعر کے لیے نئی نئی تشبیہات اور تمثیلات کا لازوال ذخیرہ جو پہلے موجود نہیں تھا مہیا ہو گیا ہے اور ہوتا جاتا ہے۔وہ اس

بات کو تسلیم نہیں کرتے کہ سوسائٹی کے ترقی کرنے سے امیجینیشن یعنی
تخیل کی طاقت ضعیف ہو جاتی ہے"(۱۱)

خواجہ الطاف حسین حالی کے اس نقطہ کی سب سے بہترین عکاسی جدید نظم نے کی ہے جب اس نے نئے خیالات نئی صورت حال اور سائنس کی ترقی سے سامنے آنے والی اشیاء کو شاعری کے لیے تشبیہات کا رنگ دے دیا۔ اس طرح شاعری کی وسعت بھی بڑھتی چلی گئی اور اس میں بیان کیے ہوئے زندگی کے مختلف رنگ بھی مزید گہرے ہوتے چلے گئے۔ یہ سارے رنگ جدید نظم میں بیان ہوئے ہیں۔ جدید نظم کو آزاد نظم کے نام سے بھی جانا جاتا ہے۔ آزاد نظم کے حوالے سے مسعود حسین رضوی ادیب لکھتے ہیں کہ:

"آزاد نظم کے حامیوں کا دعویٰ ہے کہ ان کے خیالات کے اظہار کے لیے وہ
لفظ اور محاورے، وہ صرف و نحو، وہ فصاحت و بلاغت کے معیار، وہ بحروں ذور
وزنوں کے پیمانے، جو صدیوں سے استعمال ہوتے چلے آئے ہیں، کام نہیں
دیتے"(۱۲)

یہ حقیقت ہے کہ اردو نظم نے گزشتہ لگ بھگ تین صدیوں سے اردو ادب کے گلشن کی معنی و ہیت کی سطح پر خوب آبیاری کی ہے۔ مثنوی کی صورت میں عشقیہ قصے ہوں یا نظیر اکبر آبادی کی نظم کے تناظر میں سماجی شعور کی مختلف پرتیں سب اپنی مثال آپ ہیں مگر جس طرح اختر شیرانی نے اپنی نظم میں عورت کا مثالی پیکر پیش کیا ہے۔ جس طرح تصدق حسین خالد نے عظیم جنگوں میں لقمہ بنتے ہندوستانیوں کا نوحہ بیان کیا ہے۔ جس طرز پر راشد نے استعماریت کے خلاف ذہنی اور فکری رسمیات کو وسعت دی ہے۔ جس طرح میراجی نے "یگانگت" جیسی نظموں سے برائی اور بھلائی کے تصورات کو نئے زاویہ سے پیش کیا ہے۔ جس طرح منیر نیازی نے "ہمیشہ دیر کر دیتا ہوں میں" اختر حسین جعفری نے "جہاں دریا اترتا ہے" انوار فطرت نے "چیخ ری او مہا چیخ" رفیق سندیلوی نے "غار میں بیٹھا شخص" روش ندیم نے "دہشت کے موسم میں لکھی نظمیں" وحید احمد نے "ہم شاعر ہوتے ہیں" آفتاب اقبال شمیم نے "زمانہ بازار بن گیا ہے" فرخ یار نے "ہم پیشی بھگتنائے آئے ہیں" حسن عابدی نے "بوڑھا گاڑی کھینچ رہا ہے" فہمیدہ ریاض نے "بدن دریدہ" حمیدہ شاہین نے "اک بے دھیانی" افتخار عارف نے "بارہواں کھلاڑی" جیسی نظموں میں اپنے سماجی تناظر کو بیان کیا ہے۔ بیسویں صدی کی

آٹھویں دہائی میں اپنی انتہاؤں کو چھونے والی اس نظم نے انسانی زندگی کی بدصورتی کے اظہار کے ساتھ بے سمت و بدہیت صارفی ثقافتیت، ملٹی نیشنل کلچر سے پھوٹتی بیگانگی، عالمی قصاد بازاری، مفاد پرستی، سیاہ دولت کے انبار لگانے والے کمیشن ایجنٹوں اور نفاق سے بھرے ذہنوں کو پرت در پرت کھول کر بیان کیا ہے۔ یہ شعر امغربی ہیت سے متاثر ضرور ہیں مگر ان کے ہاں مشرقی اقدار کے ساتھ ساتھ خدا اور کائنات کے باہمی روابط کا شعور ملتا ہے اس نظم میں اپنے اطراف پھیلے انسانوں کے مختلف چہرے تمثال کیے جاتے ہیں یہی وجہ ہے کہ اکیسویں صدی کا نمائندہ شاعر ارشد معراج "دوستوں کے لیے" کے عنوان سے نظمیں تخلیق کرتا ہے۔ یہ نظم جدید صنعتی، صارفی، مشینی زمانے میں انسان کی کم مائیگی اور بے توقیری کا وہ بیان ہے جو اسے اپنے اطراف پھیلی زندگی سے ہم انگیز کر کے نئے جہانوں کا شناور بناتا ہے۔ جدید نظم نے اپنے ہیتی تکنیکی اور جمالیاتی پہلو اردو معاشرے کی تہذیب، تاریخ، تمدن، ثقافت کو نئی صورتوں میں تلاش کیا ہے اور تلاش و بسیار کا یہ عمل نہ صرف ابھی جاری ہے بلکہ یہ اپنے معروض اور اس کی تخلیقی پیشکش میں اپنی مثال آپ ہے۔ حقیقت اور متخیلہ کو باہم ملا کر پیش کرنا جدید نظم کا بنیادی وصف ثابت ہوا۔ جدید نظم میں جہاں زرخیز تخیل اپنی کارفرمائی دکھایا ہوا ملتا ہے تو وہیں پر اس نظم میں انسانی عقل اور فہم و فراست کے نقش جگہ جگہ پھیلے ہوئے ہیں۔ یہ انسانی دماغ کی قوت تخلیق سے زندگی کے چھوٹے چھوٹے ذرات اور واقعاتی مشاہدات کو ایک کل میں بیان کرنے پر قدرت رکھتی ہے۔ یوں بھی کہا جا سکتا ہے کہ جدید نظم بصری موضوعات واقعات مشاہدات کو بصری کے ساتھ ساتھ سمعی تجربات کا حصہ شعری صورت میں بناتی ہے۔ جدید نظم ایک طویل انکشافی سلسلہ ہے جو نظمیہ حالت میں حقیقت کے داخل سے خارج کی راہیں ہموار کرتا ہے۔ ان نظموں کو زمانی اور مکانی تناظر میں دیکھیں تو صورت حال اور بھی واضح اور بامعنی ہو جاتی ہے۔ مکان کے داخل سے زمان کا وجود اور زمان کی بیکرانی سے مکان کی نشاندہی جدید نظم کا خاصہ ہیں۔ یہ فہرست اور طویل ہو سکتی ہے جسے دوسری نشست پر اُٹھا رکھتے ہیں۔

حوالہ جات

۱. آل احمد سرور، ادب میں جدیدیت کا مفہوم، مشمولہ، جدیدیت اور ادب، مرتبہ، (شعبہ اردو علی گڑھ مسلم یونیورسٹی، علی گڑھ)، ۱۹۶۹، ص ۸۴

۲. شہزاد منظر، پاکستان میں اردو ادب کی صورت حال، (پورب اکادمی راولپنڈی) ۲۰۱۴، ص ۱۰۹

۳. شمیم حنفی، جدیدیت کی فلسفیانہ اساس، (سنگ میل پبلی کیشنز، لاہور)، ۲۰۰۸، ص ۵۱

۴. سید قدرت نقوی، نظیر اکبر آبادی کی نظم نگاری، (ایجوکیشنل پبلشنگ ہاوس، نئی دہلی)، ۱۹۹۱، ص ۲۸

۵. احتشام حسین، سید، جدید ادب، منظر اور پس منظر، مرتب، جعفر عسکری، (اتر پردیش اردو اکادمی، لکھنو) ۱۹۸۲، ص ۲۱۴

۶. شیخ عبد القادر، دیباچہ، بانگ درا، مشمولہ "کلیات اقبال اردو، (لاہور، اقبال اکادمی، پاکستان، اشاعت ششم، ۲۰۰۴ء) ص ۴۶

۷. ڈاکٹر انوار الحق، مضمون اقبال کا تصور خدا، اردو نظموں کی روشنی میں "مشمولہ "خیابان "شمارہ ۳۷ خزاں، پشاور ۲۰۱۲

۸. شہزاد منظر، پاکستان میں اردو ادب کی صورت حال، (پورب اکادمی راولپنڈی) ۲۰۱۴، ص ۱۰۸

۹. مزید تفصیل کے لیے دیکھیں مجلس ترقی ادب سے شائع کردہ یونس جاوید کی کتاب "حلقہ ارباب ذوق"، میرا جی کی تنقیدی کتاب "اس نظم میں" بھی حلقہ ارباب ذوق میں جدید نظم کے فروغ کی کوششوں پر مشتمل ہے۔ میرا جی نے عالمی شاعروں کے تعارف اور نظموں کے ترجمے اپنی کتاب "مشرق و مغرب کے نغمے "میں شامل کیے ہیں۔

۱۰. سید مسعود حسین رضوی ادیب، ہماری شاعری، (پورب اکادمی، راولپنڈی) ۲۰۱۵، ص ۲۱، ۲۰

۱۱. الطاف حسین حالی، مقدمہ شعر و شاعری، (پاپولر پبلشنگ ہاوس، لاہور) ۲۰۰۰، ص ۴۷

۱۲. سید مسعود حسین رضوی ادیب، ہماری شاعری، (پورب اکادمی، راولپنڈی) ۲۰۱۵، ص ۳۷